© rasailojaraid.com

رسائل و مسائل

ڈارون کا نظریۂ ارتقاء

"ڈارون کا نظریۂ ارتقاء موجودہ زمانہ کے علمی مسلمات میں سے ہے، مگر قرآن کا مطالعہ کرتے ہوئے بار بار یہ محسوس ہوتا ہے کہ دونوں کے نقطۂ نظر میں قطعی تضاد ہے۔ سب سے زیادہ صریح بات جو یک نظر محسوس ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ قرآن کا انسان اول روز سے انسان ہی تھا جسے ایک خاص تاریخ کو یکایک ایک تخلیقی عمل سے پیدا کر دیا گیا، پھر اس سے انسانی نسل چلی لیکن ہم کو جو طبعی علوم پڑھائے جاتے ہیں وہ شہادت دیتے ہیں کہ انسان حیوانات میں سے بتدریج ترقی کرتا ہوا آیا ہے اور اس ارتقائی تسلسل میں کسی نقطہ پر انگلی رکھ کر نہیں کہا جا سکتا کہ ایک خاص تاریخ کو اس مرحلہ پر حیوانیت ختم ہوئی اور انسانیت کی ابتدا ہوئی جس کے متعلق قرآن کہتا ہے کہ فَاِذَا نَفَخْتُ فِیْهِ مِنْ رُّوْحِیْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِیْنَ۔ یہ قرآن اور نظریۂ ارتقاء کے اختلاف کی صرف ایک صریح مثال ہے، ورنہ تخلیق کے مسئلے میں بکثرت تفصیلات ایسی ہیں جہاں ان دونوں کے بیانات ایک دوسرے سے ٹکراتے ہیں۔ ان چیزوں کو دیکھ کر موجودہ سائنس کا ایک طالب علم اپنے ایمان کو محفوظ نہیں رکھ سکتا۔ کیا آپ اس مشکل کا کوئی حل بتا سکتے ہیں؟"

آپ نے جو سوال کیا ہے خط و کتابت اس کے جواب کی کہاں متحمل ہو سکتی ہے۔ ایک نظریہ جو بڑے دلائل کے ساتھ پیش کیا گیا ہے اور موجودہ دور کے تمام بڑے بڑے علوم میں سرایت کر چکا ہے، اس کا تنقیدی مطالعہ اور قرآن کے بیانات سے اس کا تقابل ایک مستقل تحقیقی بحث چاہتا ہے جس کے لیے ایک مضمون میں بھی گنجائش نہیں نکل سکتی کجا کہ ایک مختصر خط میں۔ تاہم آپ کے اطمینان کے لیے چند اشارات کیے دیتا ہوں۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

پہلی بات یہ سمجھ لیجیے کہ ڈاروِن کا نظریہ جس طرح ابتدا میں صرف ایک نظریہ تھا اسی طرح آج تک نظریہ (Theory) ہی ہے، واقعہ (Fact) ابھی تک ثابت نہیں ہو سکا ہے۔ نظریہ اور واقعہ کا فرق آپ جیسے تعلیم یافتہ آدمی سے پوشیدہ نہیں ہو سکتا۔ اور یہ بھی آپ سمجھ سکتے ہیں کہ آدمی کے لیے اپنے ایمان پر نظرِثانی کرنے کا سوال صرف اُس صورت میں پیدا ہوتا ہے جہاں وہ چیز جس پر وہ ایمان رکھتا ہے کسی ایسی چیز سے ٹکرا جائے جو ثابت شدہ واقعہ ہو۔ قیاسات و نظریات کی ٹکر بھی جو ایمان نہ سہ سکے وہ کسی کام کا ایمان نہیں، خصوصاً جبکہ ان "علمی" قیاسات کی سائنسی تاریخ شاہد ہے کہ یہ بیچارے خود ایک صدی کے علمی تغیرات کی ٹکر بھی مشکل ہی سے سہ سکے ہیں۔

علم الحیات (Biology) کے جس مشکل ترین مسئلہ میں سائنس کے علما اُلجھ رہے ہیں وہ دراصل یہ سوال ہے کہ زندگی کا مبدأ کیا ہے۔ قرآن اس کا جواب یہ دیتا ہے کہ زندگی کا مبدأ خدا کا حکم (امرِ ربّ) ہے۔ وہ صرف خدا کا حکم ہی ہے جو بے جان مادے میں آثارِ حیات پیدا کر دیتا ہے۔ لیکن موجودہ سائنس جن لوگوں کے ہاتھوں نشوونما پا رہا ہے وہ اس کارخانۂ ہستی میں کسی فوق الفطرت ذات (Super natural) کی کارفرمائی و کاریگری ماننے اور محسوس کرنے سے ہر ممکن طور پر پہلو بچانا چاہتے ہیں۔ ان کی خواہش یہ ہے کہ اسی کارگاہِ فطرت میں انھیں اس کی کارفرما طاقت کا بھی کہیں سراغ مل جائے۔ یہی بنیادی غلطی ان کے لیے وہ مشکل سوالات پیدا کرتی ہے جنھیں حل کرنے کے لیے وہ قیاس آرائیاں کرتے ہیں اور پھر اسی قیاس آرائی کا سلسلہ انھیں کائنات کے تنوع اور ان کے تفاضل کی توجیہ تک دراز ہوتا ہے۔ ان میں سے جو لوگ فی الواقع علمی ذوق رکھنے والے ہیں وہ تو قیاس کو قیاس ہی کی حد تک رکھتے ہیں، لیکن جو کم تر درجہ کے نوآموز ہیں (جن کو میں "علمی کم ظرف" اور دنیا کے علم کا "نودولتا" سمجھتا ہوں) ان کا حال یہ ہے کہ قیاسات و نظریات کو اس شان سے بیان کرتے ہیں گویا وہ حقائق ہیں جو علمی طور پر ثابت ہو چکے ہیں۔ اسی سے سائنس کے مبتدیوں کو غلط فہمیاں لاحق ہوتی ہیں۔

ڈاروِن نے جب تحقیق و تجسس کا آغاز کیا اس وقت اگر وہ قرآن کے دیے ہوئے نقطۂ آغاز (Starting point) سے چلتا تو اس نتیجہ پر پہنچتا کہ زندگی کی شکلوں میں یہ تنوع اور تفاضل جو ایک بے نظیر ترتیب کے ساتھ واحد الخلیہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بُھنگے (Unicellular molecule) سے لے کر انسان تک نظر آ رہا ہے، یہ ایک حکیم کے منصوبے (Design) کا نتیجہ ہے جو مختلف انواع کی زندگی کے لیے مناسب ماحول اور سازگار حالات فراہم کرنے کے بعد اُنھیں ان کی مخصوص نوعی خصوصیات کے ساتھ بتدریج وجود میں لاتا چلا گیا ہے اور جن انواع کی ضرورت اس کے خاکے میں باقی نہیں رہی ہے انھیں مٹاتا بھی رہا ہے۔ لیکن جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں، یہ لوگ منصوبہ ساز (Designer) کو ماننے سے جی چراتے ہیں اور اس کی کارگاہ میں اس کی کارفرمائی کے نشانات دیکھنا نہیں چاہتے اس لیے جو شہوات ان کے مشاہدے میں آتے ہیں ان کی توجیہ یہ کسی ایسے طریقہ سے کرنا چاہتے ہیں جس سے یہ کارخانہ خود بخود چلتا اور ترقی کرتا ہوا سمجھا جا سکے۔ یہی وجہ ہے کہ ڈارون نے تنوع اور تفاضل کی توجیہ ارتقا کے اُس نظریے سے کی جو اس کے نام سے مشہور ہے، اور یہی وجہ ہے کہ یورپ جو اس وقت تک اپنے الحاد کو پاؤں کے بغیر چلا رہا تھا، لپک کر یہ لکڑی کے پاؤں ہاتھوں ہاتھ لیے اور نہ صرف اپنے سائنس کے تمام شعبوں میں، بلکہ اپنے فلسفہ اخلاق اور اپنے علوم عمران تک میں اُن کو نیچے سے فٹ کر لیا۔ حالانکہ علمی اور عقلی حیثیت سے اِس کی توجیہ میں اتنے جھول ہیں کہ مشکل ہی سے کوئی صاف دماغ کا آدمی اس کو منظر کی ممکن توجیہات میں ایک قابل لحاظ توجیہ قرار دے سکتا ہے۔

پیچیدہ اور گہری علمی تنقید سے بچتے ہوئے میں آپ کو ایک مثال سے ڈارونی نظریہ ارتقا کا اصلی و بنیادی ضعف سمجھانے کی کوشش کروں گا۔ فرض کیجیے کہ مریخ سے سائنس کا ایک پروفیسر اپنے کچھ شاگردوں کے ساتھ علمی تحقیقات کے لیے زمین پر آتا ہے اور ان لوگوں کی بینائی میں کوئی ایسی کمزوری ہے جس کی وجہ سے وہ یہاں انسان کو نہیں دیکھ سکتے البتہ انسان کی مصنوعات اور اس کے تمدن کے آلات و وسائل کو بخوبی دیکھ سکتے ہیں۔ یہ محقق پروفیسر یہاں انسان کی جو صنعتیں دیکھتا ہے ان میں الگ شکلوں اور نوعیتوں کا فرق بھی نظر آتا ہے، ان میں سے بعض کو وہ بعض سے بہتر بھی پاتا ہے، دورانِ تحقیق میں اس کو یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ بعض چیزیں پہلے رائج نہ تھیں، بعد میں رائج ہوئیں، بعض قدیم سے رائج رہی ہیں اور اب تک رائج چلی آ رہی ہیں، اور بعض پہلے رائج تھیں مگر اب مفقود ہیں۔ کچھ زمانہ تک وہ اس بکھرے ہوئے منظر کی اشیا کو اپنے ذہن میں مرتب کرنے کی کوشش کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ مختلف قسم کی اشیا کو انواع اور اصناف میں تقسیم کر کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ان کے درجات قائم کر لیتا ہے۔ اس کے بعد وہ تحقیق کا قدم آگے بڑھاتا ہے اور یہ معلوم کرنا چاہتا ہے کہ آخر یہ تنوّع اور تفاضل اشیاء نہیں کیسے، اور ان کے تنوّع اور تفاضل میں اور بعض کے باقی اور بعض کے معدوم ہو جانے میں کیا اسباب اور کیا قوانین کار فرما ہیں۔ اس سوال کا ایک جواب اگرچہ یہ بھی ممکن تھا کہ یہاں غالباً ایسی اور ایسی صفات کی کوئی ہستی موجود ہے جو ان چیزوں کو اپنی مختلف مصلحتوں کے لحاظ سے بناتی ہے، جن چیزوں کی ضرورت باقی ہے انھیں بنائے چلی جاتی ہے، جن کی ضرورت باقی نہیں رہی انھیں بنانا چھوڑ چکی ہے، اور جن کی ضرورت اب کسی دوسری شکل کی چیز سے بہتر طور پر پوری ہونے لگی ہے انھیں بنانا چھوڑتی جا رہی ہے۔ لیکن کسی وجہ سے یہ تاریخی محقق کسی ایسی ہستی کو فرض کرنے سے بچنا چاہتا ہے اس لیے وہ قیاس کا رُخ دوسری طرف پھیر کر اپنے منظر کی توجیہ اس طرح شروع کر دیتا ہے کہ ان تمام مصنوعات کی ابتدا غالباً صنعت کے ایک ہی ابتدائی بیج سے ہوئی تھی، پھر اس میں ارتقا شروع ہوا اور ماحول کے فلاں فلاں اسباب سے ان اشیاء کی مختلف انواع وجود میں آئیں، پھر ان انواع نے ایک دوسرے کے خلاف کشمکش شروع کی اور ایک دوسرے سے بڑھ کر اپنے ماحول سے اپنے آپ کو موافق کرنے اور ماحولی طاقتوں سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی، اس کشمکش میں جو مصنوعات ناکام رہ گئیں وہ مٹ گئیں اور جو کامیاب ہوئیں انھیں ماحول نے بقاء کے لیے چن لیا۔ یہی کشمکش ان مصنوعات کی شکلوں اور صفتوں کے ارتقاء کی موجب ہوئی اور بقاء کی جدوجہد ہی میں ایک نوع کی چیزیں ترقی کرتے کرتے دوسری نوع کی مصنوعات میں تبدیل ہوتی چلی گئیں۔ مثلاً چھکڑے کی نوع مدتوں تک زور لگاتی رہی یہاں تک کہ اس کے بعض قابل تر افراد کی ترکیب میں تغیرات رونما ہونے چلے گئے اور بالآخر وہ بگھی میں تبدیل ہو گئے۔ پھر بگھی کی نوع نے زور لگانا شروع کیا حتیٰ کہ اس کے بعض قابل افراد کی ترکیب میں پھر تغیر ہونے لگا اور بالآخر وہ موٹر میں تبدیل ہو گئے۔ پھر بعض موٹروں نے اونچے اونچے درختوں اور مکانوں اور عمارتوں کو دیکھ کر ان کے اوپر پہنچنا چاہا اور اس کوشش میں اچکنا شروع کیا یہاں تک کہ اچکتے اچکتے ان کے پر نکل آئے اور بالآخر وہ ہوائی جہاز میں تبدیل ہو گئیں۔ اس محقق جلیل کے ساتھ مورخ کے سائنس کالج سے جو طالب علم آئے تھے وہ عرض کرتے ہیں کہ قبلہ، چھکڑے سے بگھی اور بگھی سے موٹر اور موٹر سے ہوائی جہاز تک بتدریج جو ارتقا ہوا ہو گا تو لازماً چھکڑے اور بگھی کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

درمیان، اور مکھی اور موٹر کے درمیان، اور موٹر اور ہوائی جہاز کے درمیان بکثرت ایسی کڑیاں پائی جانی چاہییں جو ان میں سے ہر دو نوعوں کے بیچ کا فاصلہ بھی طے کر رہی ہوں، اور اس فاصلہ میں ہر ہر قدم پر ان درمیانی کڑیوں کے مختلف افراد ایک قافلے کی طرح آگے پیچھے چلتے نظر آنے چاہییں۔ مثلاً مکھی اور موٹر کے درمیانی فاصلے میں بہت سی ایسی اقسام کی گاڑیاں ملنی چاہییں جو ابھی کچھ مکھی ہوں اور کچھ موٹر ہونے کے مختلف درجوں میں ہوں، اور اسی طرح موٹر اور ہوائی جہاز کے درمیان ایسی بہت سی اقسام کی سواریاں پائی جانی چاہییں جو ابھی پر نکال رہی ہوں۔ اس سوال کو سن کر پروفیسر صاحب کچھ دیر سوچتے ہیں، پھر کہتے ہیں کہ ہاں، یہ درمیانی کڑیاں ضرور پائی جاتی ہوں گی۔ مکھی سے "مکھ موٹرا" بنا ہو گا، پھر وہ "موٹر مکھے" میں تبدیل ہوا ہو گا، پھر اس نے "موٹر مکھ" کی شکل اختیار کی ہو گی، پھر وہ موٹر میں تبدیل ہو گیا جسے تم دیکھ ہی رہے ہو، پھر موٹر اپنی ارتقائی جدوجہد سے "پنکھ موٹرا" بنی ہو گی، پھر وہ "موٹر پنکھ" میں تبدیل ہوئی ہو گی، پھر "موٹر پنکھا" پیدا ہوا ہو گا، پھر وہی تبدیل ہو کر یہ ہوائی جہاز بن گیا جو تمہارے سامنے موجود ہے۔ یہ بیچ کی کڑیاں جن کے نام میں نے لیے ہیں ضرور کہیں نہ کہیں پائی جاتی ہوں گی، جاؤ اور مٹی کے ڈھیروں میں انھیں تلاش کرو۔ استاد تو یہ کہہ کر خاموش ہو گیا، مگر شاگرد جو مرتے ہی سے انسان کے خلاف ایک تعصب دل میں لیے ہوئے آئے تھے، اس کی اس نادر تحقیق پر ایسا ایمان لائے کہ انھوں نے استاد کے کلام میں سے "غالباً" اور "ہوا ہو گا" کو بھی نکال دیا اور اب وہ اپنی تقریروں اور تحریروں میں اس کو "یقیناً" اور "ہے" کے ساتھ بیان کرنے لگے ہیں۔ ان کے علمی لٹریچر میں "موٹر مکھا" اور "پنکھ موٹرا" وغیرہ خیالی موجودات کا ذکر اس طرح آتا ہے گویا کہ یہ چیزیں کہیں ان کے میوزیم میں موجود ہیں۔

ڈارون کے نظریہ اور ڈاروینیت کے متبعین پر یہ تمثیل بالکل ٹھیک ٹھیک راست آتی ہے۔ اس نظریہ کے اصلی لٹریچر کو آپ دیکھیں گے تو آپ کو معلوم ہو گا کہ اس کی ساری بنیاد "ہو گا" پر ہے، حالانکہ سائنس میں اصل قابل اعتبار چیز "ہے" ہے نہ کہ "ہو گا"۔ میں پوچھتا ہوں کہ اگر سائنس میں "ہو گا" بھی کوئی اہمیت رکھتا ہے تو ایک "ہو گا" اور دوسرے "ہو گا" میں فرق کیوں ہے۔ خصوصاً جبکہ ایک "ہو گا" دوسرے "ہو گا" سے کچھ زیادہ ہی لگتا ہوا ہو۔ جب آپ اس کے لیے تیار ہیں کہ شہوات کی توجیہ میں "ہو گا" کو بھی مان لیں تو ڈاروِن کے "ہو گا" سے میرا یہ "ہو گا" کچھ زیادہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہی لگتا ہوا ہے کہ زندگی کا آغاز اور زندہ اشیاء کا تنوع اور ان کا تفاضل سب کا سب ایک حکیم کے امر اور حکیمانہ تدبر سے ہے۔ میرا یہ "ہوگا" ڈارون کے "ہوگا" سے زیادہ بہتر طریقہ پر تمام شہوداًت کی توجیہ کرتا ہے، کسی سوال کو لاجواب نہیں چھوڑتا، اور سب سے بڑھ کر اس کے حق میں وجہ ترجیح یہ ہے کہ اس طرف تو کوئی آدمی صداقت کے ساتھ "ہوگا" سے زیادہ کچھ کہنے کے قابل نہیں ہے مگر اس طرف کثرت صالح ترین انسان، جو کبھی جھوٹ بولتے نہیں پائے گئے، پورے زور کے ساتھ یہ دعویٰ کر چکے ہیں کہ "ہے" اور ہم آنکھوں دیکھی بات کہہ رہے ہیں کہ "ہے"۔ پھر کیا وجہ ہے کہ سائنس کے طالب علم ادھر آنے کے بجائے ادھر جا رہے ہیں؟ کیا اس کی کوئی وجہ اس خدا بیزاری (Theopholia) کے سوا ہے جو قرون متوسطہ سے سائنس کے طالب علموں کو میراث میں ملی ہے؟ اگر یہی بات ہے تو "جذبات" کا نام لوگوں نے "علم" کیوں رکھ چھوڑا ہے۔

علمی اور عقلی حیثیت سے اس نظریہ میں جو کمزوریاں ہیں ان سے قطع نظر کرکے اگر دیکھا جائے کہ فلسفے اور اخلاق اور علوم تمدن و اجتماع میں داخل ہو کر اس ظالم تخیل نے انسان کو برباد کرنے کے لیے کیسے شدید فتنے برپا کیے ہیں، تو شاید کسی صاحب بصیرت آدمی کو یہ ماننے میں ذرہ برابر تامل نہ ہوگا کہ موجودہ دور میں جن نظریات نے انسان کے ساتھ سب سے زیادہ دشمنی کی ہے، یہ ڈارونیت ان سب کی سرتاج ہے۔ اگر انسان کی فلاح چاہنے والوں کے ہاتھ میں اقتدار ہو تو وہ اس نظریے کی تعلیم دینے والوں کے ساتھ اس سے زیادہ سخت برتاؤ کریں جو انارکی پھیلانے کے لیے بم سازی اور ڈاکہ زنی کی تعلیم و تبلیغ کرنے والوں سے کیا جاتا ہے۔

نواقضِ وضو

"اسلام نے جسم و لباس کی طہارت و نظافت کا جو لحاظ رکھا ہے اس کی قدر و قیمت سے کوئی عقل انسانی انکار نہیں کر سکتی۔ لیکن اس سلسلہ میں بعض جزئیات بالکل ناقابل فہم معلوم ہوتے ہیں۔ مثلاً ریح کے نکلنے سے وضو کا ٹوٹ جانا، حالانکہ جسم کے ایک حصہ سے محض ایک ہوا کے نکل جانے میں بظاہر

© rasailojaraid.com